

مختصر افسانہ

مختصر افسانہ جدید دور کی اہم نثری صنف ہے۔ اس کے ذریعے کسی شخص کی زندگی کے ایک اہم پہلو یا کسی واقعہ کا بیان اس طرح کیا جاتا ہے کہ پڑھنے والے کے دل و دماغ پر اس کا اثر گہرا پڑے۔

افسانے کی متعدد تعریفیں کی گئی ہیں۔ ایک نقاد کا کہنا ہے کہ افسانہ ایسی نثری کہانی ہے جو ایک ہی نشست میں پڑھی جاسکے۔ ایک اور نقاد کا کہنا ہے کہ افسانہ ان کہانیوں سے بالکل مختلف ہے جو اتفاق سے کہانی ہونے کے علاوہ مختصر بھی ہوتی ہیں۔ یہ کہانی کی ایک واضح فنی صورت ہے۔ ایجاز و اختصار، جدت، فنی حُسن اور تخیل کی چاشنی اس کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ افسانہ سیدھی سادی کہانی نہیں بلکہ ایسی فنی تخلیق ہے جس میں فن کار کے ارادے اور حکمت کو دخل ہوتا ہے۔ کسی مخصوص واقعے یا صورت حال یا کسی مخصوص کردار کا نقش اس طرح ابھارا جاتا ہے کہ پلاٹ یعنی واقعات کی ترتیب و تنظیم پڑھنے والے کو متاثر کر سکے۔

افسانے کے ماہروں نے اس کی جو تعریفیں بیان کی ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ افسانہ بیانیہ تخلیقی تحریر ہے۔ افسانے میں کسی ایک کردار یا کرداروں کے ایک مخصوص گروہ کے نقوش یا ذہنی کشش کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ افسانے میں واقعات کی تفصیل، کرداروں کی گفتگو اور منظر و ماحول کی پیشکش بہت نپلی ہوتی ہے۔

ہر افسانے کے لیے پلاٹ، کردار اور زمان و مکان لازمی اجزا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی لحاظ سے افسانے کی اقسام بھی بیان کی گئی ہیں یعنی پلاٹ کا افسانہ، کردار کا افسانہ یا پس منظر کا افسانہ۔

افسانے کی کامیابی کے لیے کچھ ناقدین، افسانہ نگار کے نقطہ نظر کو بھی اہم قرار دیتے ہیں۔ افسانہ نگار کے اسلوب میں رمز، کنایے اور تاثیر کو بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اردو میں مختصر افسانے کا آغاز بیسویں صدی کے ساتھ ہوا۔ ہندوستان میں کتھا کہانی کا رواج تو صدیوں پرانا ہے، اسی طرح عربی اور فارسی میں داستان اور قصص کی روایت ملتی ہے لیکن مختصر افسانے کی صنف اردو میں مغرب کے اثرات کی دین ہے۔ اردو میں سب سے پہلے پریم چند اور یلدرم نے افسانے لکھے۔ ان کے فوراً بعد کئی افسانہ نگار مختلف طرزوں میں نمایاں ہوئے مثلاً ل۔ احمد اکبر آبادی، نیاز فتح پوری، حجاب امتیاز علی وغیرہ نے اردو افسانے کو نئی جہت عطا کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے افسانہ اردو فکشن کی مقبول ترین صنف بن گئی۔

1936 میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ اس سے چند برس پہلے ”انگارے“ کے نام سے باغیانہ کہانیوں کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا تھا۔ ان کہانیوں نے موضوع اور فن دونوں اعتبار سے نئے تجربوں کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بہت پہلے پریم چند (1880 تا 1936) نے اردو افسانہ نگاری کو عروج پر پہنچا دیا تھا۔ پریم چند نے حقیقت نگاری اور نفسیاتی کردار نگاری کے ساتھ مشرقی یوپی کے دیہاتوں کی زندگی اور قومی زندگی میں نمایاں ہونے والے سیاسی اور جڑی جاذبات کو بھی نمایاں کیا۔ چند ہی برسوں میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی اور بلونت سنگھ کے ہاتھوں اردو افسانے نے بہت ترقی کی۔ زندگی کے گونا گوں مسائل اور موضوعات پر لکھا جانے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ انسان دوستی، سماجی اصلاح اور قومی شعور کے اظہار کا چلن بھی عام ہوا۔

آزادی کے بعد ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں قرۃ العین حیدر نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ 1960 کے لگ بھگ اردو میں علامتی افسانے کا آغاز ہوا۔ اس رنگ کے نمائندہ افسانہ نگار: انتظار حسین، سریندر پرکاش، انور سجاد، بلراج مین را اور خالدہ حسین ہیں۔ حقیقت نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے والوں میں حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، احمد ندیم قاسمی،

شوکت صدیقی، اشفاق احمد، رام لال اور جوگندر پال قابلِ ذکر ہیں۔ نئی نسل کے کئی افسانہ نگاروں نے براہِ راست طرزِ بیان کے بجائے علامتی طرزِ بیان کو ترجیح دی۔ لیکن علامتی اور تجریدی افسانوں کی مقبولیت اب پہلی جیسی نہیں رہی۔

© NCERT
not to be republished

سید رفیق حسین

(1894 — 1946)

سید رفیق حسین لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں ہندوستان کے مختلف مقامات پر مقیم رہے۔ شکار کے شوق کے ساتھ ساتھ انھیں حیوانوں کی فطرت کے مطالعے کا ذوق بھی تھا۔ انھوں نے جانوروں کی نفسیات پر متعدد افسانے لکھے۔ جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے مختلف اور منفرد ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ”آئینہ حیرت“ کے نام سے شائع ہوا تھا۔ یہی مجموعہ ”شیر کیا سوچتا ہوگا“ کے نام سے بھی طبع ہوا۔ ان کی زیادہ تر تحریریں، جانوروں کی فطرت اور عمل کی عکاسی کرتی ہیں۔

رفیق حسین کے افسانوں میں مناظر فطرت کی ایسی حسین اور سچی تصویریں ملتی ہیں جن کی نظیر اردو میں کہیں اور نظر نہیں آتی۔ الفاظ کے صوتی آہنگ سے تاثر پیدا کرنے میں رفیق حسین کو کمال حاصل ہے۔ مختلف جانوروں کی آوازیں، پرندوں کی بولیاں، پانی کے بہنے کا شور، ہوا کے چلنے کی دھیمی اور تیز آوازیں، جنگل کی سائیں سائیں سب کچھ ان کے افسانوں میں موجود ہے۔ موزوں الفاظ کے توسط سے رفیق حسین اپنے قاری کو جنگل کی دنیا میں لے جا کر تمام آوازیں سناتے ہیں۔

افسانہ ”گوری ہو گوری“ کا بنیادی کردار گوری نام کی ایک گائے ہے جو وفاداری اور ایثار کا پیکر ہے۔ رفیق حسین نے سیلاب کے پس منظر میں گوری کا کردار اس طرح اُبھارا ہے کہ وہ محبت اور مامتا کی علامت بن کر دل پر اثر کرتی ہے۔

گوری ہو گوری

چوما سے کی اندھیاری رات تھی۔ بھیگی بھیگی ٹھنڈی ہوا چلتی تھی۔ جھینگروں نے جھنکار مچا رکھی تھی۔ مینڈک بول رہے تھے: ٹر، ٹر، ٹر۔ پیل کے سوکھے ڈگالے پرالو کہتا تھا: ہک، ہک، ہک ہو۔
بسنتی نے کروٹ لی، پھر منہ پر تھپڑ مارا۔ بولی: ”ہائے رے۔ ارے رام کیسے ڈانس لاگیں۔“

چھ مہینے کا بچہ پاس لیٹا تھا، اس پر ہاتھ رکھ لیا اور بسنتی بولی: ”مری جائے، پھر آئے
بیٹھا، بولت کیسے ناس پیٹا۔“
”ہک ہو، ہک ہو“

”اجی، اوجی اٹھونا۔ گھلو بولے۔ موہے ڈر لاگے۔ تنی اڑائے دے۔“
مادھو آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ کھٹیا سے نیچے پیر لٹکایا، جلدی سے پھر اوپر کھینچ لیا۔ گھبرا کر
پھر نیچے دیکھا۔ پھر ادھر ادھر دیکھا۔ چھوٹا سا کچا گھر تھا۔ پھوٹی چمنی کے دھوئیں سے کالی لالین
تھی۔ دھیمی روشنی میں آنگن بھر جھل جھلا رہا تھا۔ گھر بھر میں پانی بھرا تھا۔
مادھو بولا: ”جوکا ہو ارے۔“

بسنتی گھبرا کر اٹھی۔ بولی: ”اجی دیکھت کا ہو۔ ہرے رام بھیکا کو جگالو۔ ارے رم کلیا
کو جگالو۔ پانی آئے گیارے۔ ارے او بھیکا۔ رام کلیا ہو۔ اری اور م کلیا۔“
آٹھ برس کی دُلی پتلی رم کلیا جاگی۔ چھ برس کا بھیکا جاگا، دودھ پیتا پاس لیٹا بچہ
جاگا۔ یہ رویا، وہ چلائے۔

”چپ کرو چپ۔“ مادھو نے ڈانٹا۔ خاموشی میں مادھو نے کان لگائے۔ بسنتی نے دھیان

دیا۔ دو کہیں سے آواز آرہی تھی: گڑپ شل شل شل۔ گڑپ شل شل شل۔

گھلو بولا: ”ہک ہو!“

کھٹولے سے کود، پانی میں چھپ چھپاتے بچے ماں سے چمٹے۔ مادھو اٹھا۔ دیکھنے کو دروازے کی طرف چلا۔ بسنتی روئی۔ ”اجی جاوت کہاں ہو جی۔“

باہر سے آواز آئی ”مادھو بھتیہو۔ او مادھو۔ ارے باڑھ آئی۔ اٹھ رے اٹھ۔“

”شڑپ گڑپ شل شل شل۔“ پانی کے بہنے کی آواز تیزی سے بڑھ رہی تھی۔

”مم... مم... میں۔“ بکری بولی۔ ہاں ہاں آں۔ کہیں گنیاں چلا رہی تھیں۔ بارہ

گھر کے گوجر پروے میں ہل چل مچ گئی۔ سب جاگ اٹھے۔ سب بھاگنے لگے۔ کوئی پکارتا تھا۔ کوئی چلاتا تھا۔ کوئی روتا تھا۔

مادھو نے رم کلیا کو کوٹھے کی سیڑھیوں پر کھڑا کر دیا۔ بھیرکا کو گود میں لیا اور سامان رکھنے اور اٹھانے میں لگ گیا۔ بسنتی نے گود والی لڑکی کو دبائے دبائے تیرتی ہنڈیا پکڑ لی۔ مٹکا کترایا ہوا پرے سے نکلا جاتا تھا۔ اسے پیر سے روکا۔

گھر کے باہر آدمی اور جانور چلا رہے تھے۔ گھر کے اندر رم کلیا اور بھیرکا رو رہے تھے۔ پانی کا شور اندر اور باہر سب جگہ تھا۔ بسنتی اور مادھو گھر کے سامان میں لگے تھے۔ شور ہوا: ”بھاگو۔ او بسنتی نکل۔ ارے مادھو بھاگ۔“

پانی نے پچکولا لیا۔ پنڈلی سے اچکا۔ رانوں تک آیا۔

”بھاگو، بھاگو۔ مادھو بھتیہو بھاگو۔ ارے کا ہوئے گیا۔ نکلت کا ہے ناہیں۔“

باہر سے آوازیں آئیں۔ پانی نے پھر پچکولا لیا۔ آگے بڑھا۔ پیچھے ہٹا اور ران سے

کمر تک آیا۔

بسنتی روئی۔ ”ارے مورے کڑوے، اری موری ہنسی تو نکال لے رے۔“

”چل چل تو چل نکل۔ میں لایا۔ ارے نون چون تو لیے لوں۔ اوڑھنا پچھورا تو دبائے لوں۔“

پانی کا شور تھا۔ چار آدمیوں کا چلانا تھا۔ دروازے پر دھکے تھے۔ وہ کھل گیا۔ آدمی گھر میں آگئے۔ مادھو اور بسنتی کو پکڑ کر گھسیٹا۔ ”چالو چالو سب چھوڑو، جان ہی بچائے لو، چالو چالو۔“

اس گڑبڑ میں، جلدی میں، گھبراہٹ میں، اندھیرے میں، دری، بچھورے کپڑوں کے لیے پکارتی، برتنوں اور زیوروں کے لیے پھڑکتی، بسنتی نے یہ بھی کہا: ”بھیارے رم کلیا کو لے لے۔“ لائین ڈوب چکی تھی۔ اندھیرے میں کسی نے جواب دیا: ”موں اٹھائے لوں۔ تو تو چل۔ اری نکس باہرے۔“

پانی کی شل شل، رات اندھیری، بادل کی گرج۔ کمر کر، سینے سینے پانی میں بیس تیس آدمی، پچاس ساٹھ مویشی چلے۔ ہر آدمی بول رہا تھا۔ ہر جانور چلا رہا تھا۔ کوئی گرتا تھا، سنبھالتا تھا۔ کوئی ڈوبتا تھا، دوسرا اُبھارتا تھا۔ شروع میں تو سب جتھا بنائے ایک دوسرے کو سنبھالتے پُروے سے باہر چلے۔ آدموں کے باغ کے اندر سے آکر پون میل کے فاصلے پر ریل کی پٹری کا رُخ کیا۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھتے گئے اندھیرے میں ایک دوسرے سے الگ ہوتے گئے۔ اندھیری رات تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ پانی کمر اور نچا تھا۔ ساتھی سب بچھڑ بچھڑ کر الگ ہو گئے تھے۔ ادھر ادھر۔ دُور اور نزدیک آوازیں ان کی آرہی تھیں:

”جائکی ہو جائکی!“

”آئے رہوں دادا!“

”مُر لی ہو مُر لی!“

”بھلا رہے بھلا۔ چالے چالو!“

ڈکراتی بھینسیں، چلاتی گائیں، مہیاتی بکریاں، روتے بچے، سہمی عورتیں، پکارتے مرد، سب بھگے، سب پانی ٹپ ٹپاتے ریل کی پٹری پر چڑھے۔ اندھیری رات میں سُوئی پٹری آباد ہو گئی۔ لوگوں نے گلے پھاڑ پھاڑ کر پوچھنا شروع کر دیا کہ کون کون آگیا ہے اور کون کون رہ

گیا۔ ہر کسی کو کسی نہ کسی کی فکر تھی۔ چھوٹے سے پروے کی پوری آبادی کی مردم شماری کی گئی۔ آدمیوں اور جانوروں دونوں کی گنتی کی گئی۔ جانور سب موجود تھے۔ آدمیوں میں ایک... کا لڑکا اور بچوں میں رم کلیا کم تھی۔

بسنتی نے رم کلیا کے واسطے پلک پلک کر رونا شروع کر دیا۔ مادھو بھی چپکا کھڑا روتا تھا۔ وہیں پران کی گوری گائے کھڑی اڑاتی تھی: ”تو کاں آں ہ۔ تو کاں آں ہ۔“ یہ بھی دُکھ پیٹی ماں ہے۔ ارے کوئی جانے یا نہ جانے پھٹرا اس کا بھی نہیں ملتا ہے۔ دُکھیا روتی ہے: ”تو کاں آں ہ۔“

روتی بچکیاں لیتی بسنتی کے پاس بولتی ہوئی گائے آئی۔ بسنتی نے اس کی گردن میں باہیں ڈال دیں اور روتی:

”گوری رے موری رم کلیا..... لیٹھ لیٹھ لیٹھ لیٹھ“

”گوری رے اب تو ہے کون پڑائے..... لیٹھ لیٹھ لیٹھ لیٹھ“

”گوری توری رم کلیا تو گئی رے..... لیٹھ لیٹھ لیٹھ لیٹھ“

”گوری توری رم کلیا..... لیٹھ لیٹھ لیٹھ لیٹھ“

گائے نے وہی لمبی آواز نکالی..... ”تو کاں آں ہ“

کوئی جانے نہ جانے۔ دل کی لگی رام جانے۔ گائے نے چلا چلا کر اور بسنتی نے سسکیاں لے کر آخر صبح کر ہی دی۔ نکلتے دن کی پہلی روشنی میں سب کی آنکھیں گوجر پروے کی طرف اٹھ گئیں: سامنے چھوٹا سا آموں کا باغ تھا۔ اسی کے برابر اور کچھ اس کی آڑ میں گوجر پروا آباد تھا۔ لیکن اب وہاں کچھ نہ تھا۔ اگر کوئی بچا کھنچا مکان ہوگا تو درختوں کی آڑ میں ہوگا۔ سامنے تو باغ ہی باغ تھا جس کے درخت اپنے ہرے ہرے ہاتھ پانی پر پھیلائے مل رہے تھے اور پھر ان کے پار میلوں میلوں جہاں جہاں تک نظر جاتی پانی ہی پانی تھا۔

جب تک اندھیرا ہاٹھ پ، گڑپ گڑپ کرتے پانی نے رم کلیا کو خوب ہی ڈرایا اور روتے روتے بے دم، گزبھر کی لڑکی کا آنے والے دن نے بھینی بھینی روشنی پھیلا کر دل ہی دہلا

دیا۔ ایک دفعہ ہی چونک کر دیکھتی ہے، تو نہ مکان ہیں نہ گاؤں ہے۔ آدھے سے زیادہ کوٹھا بہہ چکا ہے۔ ایک کونے پر خود بیٹھی ہے۔ دوسرے کونے پر کالا سانپ کنڈلی مارے، بل کھایا بیٹھا دھری زبان نکال رہا ہے۔ سامنے چاروں طرف پانی ہی پانی ہے۔

رم کلیا نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں موند لی تھیں اور ”اری میاری ... اومیری میتا۔“ کہہ کر بلک رہی تھی کہ اس کے کان میں آواز آئی: ”تو کاں آں ہ۔“ رم کلیا چونکی۔ ہاتھ آنکھوں پر سے ہٹے۔ آنسو بہتے مُردہ چہرے پر ہلکی مسکراہٹ آئی۔

”تو کاں آں ہ۔“ آواز پھر آئی۔

رم کلیا نے ”ہرے رام گوری بولے۔“ کہتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ گائے دکھائی تو دی نہیں لیکن رم کلیا نے اپنی پوری طاقت سے پکارا ”گوری، ہو گوری!“

جواب آیا: ”تو کاں آں ہ“

اور پھر باغ میں سے تیرتی ہوئی گائے نکلی۔ رم کلیا نے پھر پکارا۔ وہ اسی کی طرف بولتی ہوئی بڑھی۔ لیکن دُور سے ایک اور آواز آئی: ”اوماں آں ہ۔“

باغ کی آڑ سے پھڑے کی آواز تھی۔ گائے اُس آواز کی طرف گھوم پڑی۔ رم کلیا کا تھسا سا دل بیٹھنے لگا۔ وہ رات بھر رونے اور ہچکیاں لینے سے تھک چکی تھی۔ پھر بھی اپنی سکت بھر چلائی:

”گوری، ہو گوری!“

”گوری، ہو گوری!“

”ارے گوری رے، آئے جا!“

”گوری میتا، آئے جاری!“

لیکن گوری نے رُخ نہ بدلا۔ البتہ دو چار دفعہ سر گھما کر رم کلیا کی طرف دیکھا۔ اڑا کر بولی اور پھر ادھر ہی تیرتی چلی گئی جدھر سے پھڑے کی آواز آرہی تھی۔

باغ کی آڑ سے نکلتے ہی گائے کو پھڑا، اسی جگہ تیرتا ہوا نظر آیا، جہاں سرِ شام وہ، اس کا پھڑا اور نیل باندھے گئے تھے۔ اب وہاں نہ کھیت تھا نہ جھونپڑی۔ جگہ وہی تھی۔ لیکن اب

سوائے پانی کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ بچے کی آواز کا جواب دیتی، تیرتی تیرتی اس کے پاس گئی۔ چاروں طرف گھومی۔ اسے سونگھا۔ ایک دفعہ اس کی تھوٹھی بھی چاٹ لی اور پھر ایک طرف کو تیرتی چلی گئی مگر بچہ نہ چلا۔ وہیں تیرتا رہا۔ گائے پھر لوٹ آئی۔ چاروں طرف گھومی۔ برابر آکر اپنی کمر اور پیٹ سے اسے ڈھکیلا۔ ایک طرف چلی، بچہ ساتھ نہ آیا تو پھر لوٹ آئی۔ اب وہ کچھ سمجھ گئی۔ بچہ چھ فٹ زمین میں گڑے ہوئے گھونٹے میں رسی سے بندھا ہوا تھا۔ اور رسی بس اس قدر لمبی تھی کہ اب تک تو کسی نہ کسی طرح بچھڑے کی ناک پانی سے باہر تھی۔ لیکن اگر پانی ایک انچ بھی اور بڑھ جائے تو رسی کی وجہ سے ناک ڈوب ہی جائے۔ گائے نے مایوس ہو کر، چلاتے بچے کو وہیں چھوڑا اور پھر رم کلیا کی طرف رخ کیا۔

رم کلیا، رونے چلانے کی تھکن، ڈر، خوف اور آخر میں انتہائی نا اُمیدی کا اب تک مقابلہ کرتی رہی تھی۔ لیکن آخر آٹھ برس کی ننھی جان ہی تو تھی۔ گائے جب اس کے پاس آئی تو وہ گرتی ہوئی چھت کے کنارے بے ہوش پڑی تھی۔ گوری نے آکر کئی آوازیں دیں اور جب بھی رم کلیا کو ہوش نہ آیا تو کھر درِ گرم گرم زبان سے اس کا منہ چاٹا۔ لڑکی کو ہوش آ گیا۔ پہلے تو ڈری، پھر گوری کو دیکھا۔ ”گوری مینا۔ گوری مینا“ کہتی ہوئی اس کے گلے میں چمٹی۔ گوری نے دوپیر مارے، آگے بڑھی۔ رم کلیا چھت سے گھسٹ کر پانی میں آ گئی۔ اس نے ڈر کے مارے پیر چلائے اور چمٹ چمٹا کر گوری کی پیٹھ پر آ گئی اور وہیں چھپکلی کی طرح لیٹی لیٹی چمٹ گئی۔ گوری پھر بچھڑے کے پاس آئی۔ وہی حرکتیں پھر کیں۔ کئی دفعہ اس کے گرد چکر لگائے اور چلی۔ جب بچھڑا ساتھ نہ چلا تو لوٹ آئی۔ اب رم کلیا کی بھی سمجھ میں آ گیا کہ کیا بات ہے۔ جیسے ہی ایک دفعہ پھر گائے تیرتی ہوئی بچھڑے کے پاس گئی، رم کلیا نے اوندھے منہ لیٹے لیٹے، ایک ہاتھ بڑھا کر بچھڑے کے گلے سے رسی کی گانٹھ نکال دی۔ بچھڑا آزاد ہو گیا۔ گائے اور بچھڑا دونوں تیرتے ہوئے چلے۔ رم کلیا گائے پر چمٹی ہوئی تھی۔ باغ اور ریل کی پٹری کی طرف سے دھار چل رہی تھی۔ اس لیے یہ دونوں بہاؤ ہی کی طرف تیرتے چل دیے اور ڈھائی گھنٹے کے بعد بہت چکر کھا کر پھر، اسی ریل کی پٹری پر چڑھ آئے۔

دن کے بارہ بجے جس وقت آگے آگے گوری، پیٹھ پر رم کلیا، پیچھے ہچھڑا ”اوماں آں ہ“ کے سوال جواب کرتے گاؤں والوں میں پہنچے تو بل چل مچ گئی۔ لوگ مارے خوشی کے کودتے تھے۔ بسنتی خوشی کے مارے دھاروں دھار روتی ہوئی، کبھی رم کلیا کو گلے لگاتی تھی، کبھی ہچھڑے کو اور کبھی گوری کے چمٹتی تھی اور گائے کہتی تھی:

”تم ماں آں ہ۔ ہم ماں آں ہ“ — آواز آئی۔

”بول گوری میا کی ہے“

”بول گنوماتا کی ہے۔“

مشق

لفظ و معنی

چوماسا	:	برسات کے چار مہینے
ڈگالا	:	درخت کی موٹی ٹہنی
ڈانس	:	بڑا چھڑ
مری جائے پھر آ بیٹھا	:	مر جائے پھر آ بیٹھا
گھگھو	:	بڑا آلو
تی اڑائے دے	:	ذرا اڑادے
جوکا ہوارے	:	یہ کیا ہوا
اجی دیکھت کا ہو	:	اجی دیکھتے کیا ہو
کھٹولا	:	چھوٹی چارپائی
گنیاں	:	گائیں

ارے کائے ہو گیا	:	ارے کیا ہو گیا نکلتے کیوں نہیں
نکلت کا ہے ناہیں	:	کڑا کی جمع کڑے اودھی اور پوری طرز میں زور بیان کی
کڑوے	:	خاطر الفاظ یا اسما کے بعد الف یا و الف یا ے سے الف
	:	لگاتے ہیں۔ لہذا کڑا سے کڑوا اور کڑوا سے کڑوے۔
نون چون	:	نمک آٹا
اوڑھنا پچھورا	:	اوڑھنا پچھونا
موں اٹھائے لوں	:	میں اٹھالیتا ہوں
نکس باہرے	:	نکل باہر
آئے رہوں	:	آ رہی ہوں
بھلا رے بھلا	:	سب ٹھیک ہے
دُکھ پیٹی	:	دُھیاری
دھاروں دھار رونا	:	پھوٹ پھوٹ کر رونا

غور کرنے کی بات

- رفیق حسین کی کہانیوں میں انسان، حیوان، قدرتی طاقتوں اور مناظر کے آپس میں متاثر ہونے کی سچی عکاسی ملتی ہے۔ اُردو افسانہ نگاری میں یہی ان کی انفرادیت ہے۔
- اس کہانی میں مامتا کے جذبے کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان تو کیا جانوروں میں بھی موجود ہوتا ہے۔ گوری جو ایک گائے ہے وہ اپنے مالکن کی ممتا کو سمجھتی ہے اور سیلاب میں پھنسے اپنے بچھڑے کو بچانے سے پہلے اُس کی لڑکی رم کلیا کی جان بچاتی ہے۔
- افسانہ نگار نے اودھی کے برحیل الفاظ بکثرت استعمال کیے ہیں۔

سوالات

1. مادھو اور بسنتی موسلا دھار بارش میں اپنا گھر چھوڑ کر کیوں بھاگ رہے تھے؟
2. بسنتی کی بات سُن کر گوری نے کیا کیا؟
3. گوری نے رم کلیا کو کس طرح بچایا؟
4. رم کلیا نے گوری کے پھڑے کو بچانے کے لیے کیا کیا؟
5. مامتا کے جذبے کے آگے تمام جذبات ہیچ ہیں۔ وضاحت کیجیے
6. گوری کے کردار پر مختصراً لکھیے

عملی کام

- اگر آپ گوری کی جگہ ہوتے تو اس وقت کیا کرتے؟ اپنے لفظوں میں لکھیے
- ہم نے کڑا۔ کڑے۔ کڑوے کے بارے میں اوپر لکھا ہے۔ آپ اپنی طرز سے سوچ کر اس طرح کے لفظ لکھیں۔ مثلاً کتب سے کتب وغیرہ

عصمت چغتائی

(1915 — 1991)

عصمت چغتائی جودھ پور، راجستھان میں پیدا ہوئیں۔ بچپن آگرہ اور بے پور میں گزرا۔ اعلیٰ تعلیم علی گڑھ سے حاصل کی۔ بریلی کے ایک گرلز اسکول میں پرنسپل کی حیثیت سے پہلی ملازمت کی۔ اس کے بعد کئی اسکولوں سے وابستہ ہوئیں۔ ممبئی میں اسکولوں کی انسپکٹریس کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ اسی دوران ممبئی کی فلمی دنیا سے رابطہ قائم ہوا اور وہ ملازمت ترک کر کے فلموں کے لیے لکھنے لگیں۔

عصمت چغتائی نے اپنے بڑے بھائی عظیم بیگ چغتائی کی تحریروں سے متاثر ہو کر لکھنا شروع کیا۔ لیکن ان کی تقلید کے بجائے اپنی الگ راہ نکالی۔ متوسط مسلمان گھرانوں کی لڑکیوں اور عورتوں کی نفسیات اور مشاغل پر افسانے لکھے۔ ان کے افسانوں میں متوسط طبقے کے کرداروں کی نفسیات کے ساتھ ساتھ اخلاقی، معاشرتی اور معاشی زندگی کے تمام گوشوں کی تصویر کشی ہے۔ خواتین کی نفسیات اور مسائل پر عصمت سے پہلے بھی افسانے اور ناول لکھے گئے لیکن ان میں سے بیشتر مردوں کی تحریریں تھیں۔ عصمت نے ان مسائل کو ایک عورت ہی کی حیثیت سے دیکھا، سمجھا اور بے باکی سے تحریر کیا۔ بحیثیت استاد، پرنسپل اور انسپکٹر آف اسکول انھوں نے لڑکیوں اور شادی شدہ خواتین کے ساتھ خاصا وقت گزارا تھا۔ اس لیے ان کے مشاہدے میں گہرائی تھی۔ انھوں نے اپنے ذاتی تجربوں اور محسوسات کو چھوٹے چھوٹے واقعات کی مدد سے مربوط اور دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ منٹو کی طرح عصمت نے بھی اپنی تحریروں میں بے باکی کا مظاہرہ کیا۔ عصمت کے افسانوں کی دوسری بڑی خوبی دلکش زبان اور طرز بیان

ہے۔ عورتوں کی زبان اور محاوروں پر انہیں قدرت حاصل تھی۔ انہوں نے کرداروں کی مناسبت سے طنز و مزاح سے بھی کام لیا۔ عصمت نے افسانوں کے علاوہ ناول، ناولٹ، خاکے، ڈرامے، رپورتاژ اور ادبی مضامین بھی لکھے۔

”کلیاں“، ”چوٹیں“، ”چھوٹی موٹی“، ”دو ہاتھ“، ”دھانی بانگیاں“، ”صدی“، ”ٹیرھی لکیر“، ”سودائی“، ”دل کی دنیا“، ”جنگلی کبوتر“، ”عجیب آدمی“، ”ایک قطرہ خون“ اور ”معصومہ“ ان کی قابل ذکر کتابیں ہیں۔ ”کاغذی ہے پیرہن“ کے عنوان سے ان کی خود نوشت سوانح بھی شائع ہو چکی ہے۔

چوتھی کا جوڑا

سہ دری کے چوکے پر آج پھر صاف ستھری جازم بچھی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی کچیریل کی جھریوں میں سے دھوپ کے آڑے ترچھے قتلے پورے دالان میں بکھرے ہوئے تھے۔ محلے ٹولے کی عورتیں خاموش اور سہمی ہوئی سی بیٹھی تھیں۔ جیسے کوئی بڑی واردات ہونے والی ہو۔۔۔

آج کتنی آس بھری نگاہیں کبریٰ کی ماں کے متفکر چہرے کو تک رہی تھیں، چھوٹے عرض کی ٹول کے دوپاٹ تو جوڑ لیے گئے تھے، مگر ابھی سفید گزی کا نشان بیونتنے کی کسی کو ہمت نہ پڑی تھی۔ کاٹ چھانٹ کے معاملہ میں کبریٰ کی ماں کا مرتبہ بہت اونچا تھا۔ ان کے سوکھے سوکھے ہاتھوں نے نہ جانے کتنے جہیز سنوارے تھے، کتنے چھٹی چھوچھک تیار کیے تھے اور کتنے ہی کفن بیونتے تھے۔ جہاں کہیں محلہ میں کپڑا کم پڑ جاتا اور لاکھ جتن پر بھی بیونت نہ بیٹھتی، کبریٰ کی ماں کے پاس کیس لایا جاتا۔ کبریٰ کی ماں کپڑے کی کان نکالتیں، کلف توڑتیں، کبھی تکون بناتیں، کبھی چوکھٹا کرتیں اور دل ہی دل میں قینچی چلا کر آنکھوں سے ناپ تول کر مسکرا پڑتیں۔

”آستین کے لیے گھیر تو نکل آئے گا، گریبان کے لیے کترن میری لپچی سے لے لو۔“

اور مشکل آسان ہو جاتی۔ کپڑا تراش کر وہ کترنوں کی پنڈی بنا کر پکڑا دیتیں۔

پر آج تو سفید گزی کا ٹکڑا بہت ہی چھوٹا تھا اور سب کو یقین تھا کہ آج تو کبریٰ کی ماں کی ناپ تول ہار جائے گی، جب ہی تو سب دم سادھے ان کا منہ تک رہی تھیں۔ کبریٰ کی ماں کے پُر استقلاال چہرے پر فکر کی کوئی شکل نہ تھی، چار گرہ گزی کے ٹکڑے کو وہ نگاہوں سے بیونت رہی تھیں۔ لال ٹول کا عکس ان کے نیلگوں زرد چہرے پر شفق کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ وہ اُداس اُداس گہری جھڑیاں اندھیری گھٹاؤں کی طرح ایک دم اُجاگر ہو گئیں، جیسے گھنے جنگل میں آگ

بھڑک اٹھی ہو، اور انہوں نے مسکرا کر قینچی اٹھالی۔۔۔

سہ دری کے آخری کونے میں پلنگڑی پر حمیدہ پیر لٹکائے ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے دور کچھ سوچ رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا نمٹا کر اسی طرح بی اماں سہ دری کی چوکی پر جا بیٹھتی ہیں اور بچی کھول کر رنگ برنگے کپڑوں کا جال بکھیر دیا کرتی ہیں۔ کونڈھی کے پاس بیٹھی برتن مانجھتی ہوئی کبریٰ گن اکھیوں سے ان لال کپڑوں کو دیکھتی تو ایک سرخ جھپکی اس کے زردی مائل ٹیالے رنگ میں لپک اٹھتی۔ روپہلی کٹوریوں کے جال جب پو لے پو لے ہاتھوں سے کھول کر اپنے زانوؤں پر پھیلاتیں تو اُن کا مَر جھایا ہوا چہرہ ایک عجیب ارمان بھری روشنی سے جگمگا اٹھتا۔ گہری صندوقوں جیسی شکنوں پر کٹوریوں کا عکس تھھی تھھی مشعلوں کی طرح جگمگانے لگتا۔ ہر ٹانگے پر زری کا کام ہلتا اور مشعلیں کپکپا اُٹھتیں۔۔۔

اس چہل پہل سے دور کبریٰ شرم کی ماری، چٹھروں والی کوٹھری میں سر جھکائے بیٹھی رہتی۔ اتنے میں کتر بیونت نہایت نازک مرحلے میں پہنچ جاتی۔ کوئی کلی الٹی کٹ جاتی اور اس کے ساتھ بیویوں کی مت بھی کٹ جاتی۔ کبریٰ سہم کر دروازے کی آڑ سے جھانکتی۔

یہی تو مشکل تھی۔ کوئی جوڑا اللہ مارا چین سے نہ سلنے پایا۔ جو کلی الٹی کٹ جائے تو جان لو نائن کی لگائی ہوئی بات میں ضرور کوئی اڑنگا لگے گا۔۔۔ جو گوٹ میں کان آجائے تو سمجھ لویا تو مہر پر بات ٹوٹے گی یا بھرت کے پایوں کے پٹنگ پر جھگڑا ہوگا۔ چوتھی کے جوڑے کا شگون بڑا نازک ہوتا ہے۔ بی اماں کی ساری مشاقی اور سگھڑاپا دھرا رہ جاتا نہ جانے عین وقت پر کیا ہو جاتا کہ دھنیا برابر بات طول پکڑ جاتی۔ بسم اللہ کے روز سے سگھڑماں نے جہیز جوڑنا شروع کر دیا تھا۔ ذرا سی کترن بھی بچتی تو تلے دانی یا شیشی کا غلاف سی کر دھنک گوکھرو سے سنوار کر رکھ دیتیں۔ لڑکی کا کیا ہے کھیرے لکڑی کی طرح بڑھتی ہے۔ جو برات آگئی تو یہی سلیقہ کام آئے گا۔

اور جب سے ابا گزرے۔ سلیقہ کا بھی دم پھول گیا۔ حمیدہ کو ایک دم ابا یاد آ گئے۔ ابا

کتنے دبلے پتلے لمبے جیسے محرم کا علم۔ ایک بار جھک جاتے تو سیدھے کھڑا ہونا دشوار تھا۔ صبح ہی صبح اٹھ کر نیم کی مسواک توڑ لیتے اور حمیدہ کو گھٹنے پر بٹھا کر نہ جانے کیا سوچا کرتے۔ اور ابا کبریٰ کی جوانی کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتے۔

کبریٰ جوان تھی۔ کون کہتا تھا کہ جوان تھی۔ وہ تو جیسے بسم اللہ کے دن سے ہی اپنی جوانی کی آمد کی سناؤنی سن کر ٹھٹھک کر رہ گئی تھی۔ نہ جانے کیسی جوانی آئی تھی کہ نہ تو اس کی آنکھوں میں کرینیں ناچیں نہ اس کے رخساروں پر زلفیں پریشان ہوئیں۔۔۔ وہ جھکی جھکی سہمی سہمی جوانی جو نہ جانے کب دبلے پاؤں اس پر ریگ آئی، ویسے ہی پُپ چاپ نہ جانے کدھر چل دی۔ ابا ایک دن چوکھٹ پر اوندھے منہ گرے اور انھیں اٹھانے کے لیے کسی حکیم یا ڈاکٹر کا نسخہ کام نہ آسکا اور حمیدہ نے میٹھی روٹی کے لیے ضد کرنی چھوڑ دی۔ اور کبریٰ کے پیغام نہ جانے کدھر راستہ بھول گئے۔ جانو کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اس ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کسی کی جوانی آخری سسکیاں لے رہی ہے۔ اور ایک نئی جوانی سانپ کے پھن کی طرح اُٹھ رہی ہے۔

مگر بی اتناں کا دستور نہ ٹوٹا، وہ اسی طرح روز دو پہر کو سہ دری میں رنگ برنگے کپڑے پھیلا کر گرگڑیوں کا کھیل کھیلا کرتی ہیں۔ کہیں نہ کہیں سے جوڑ جمع کر کے شبرات کے مہینے میں کریب کا دوپٹہ ساڑھے سات روپے میں خرید ہی ڈالا۔ بات ہی ایسی تھی کہ بغیر خریدے گزارہ نہ تھا۔ منجھلے ماموں کا تار آیا کہ ان کا بڑا لڑکا راحت پولیس کی ٹریننگ کے سلسلے میں آرہا ہے۔ بی اتناں کو تو بس جیسے اک دم گھبراہٹ کا دورہ پڑ گیا۔ جانو چوکھٹ پر برات آن کھڑی ہوئی اور انھوں نے ابھی دلہن کی مانگ کی افشاں بھی نہیں کتری۔ ہول سے تو ان کے جھکے چھوٹ گئے۔ جھٹ اپنی منہ بولی بہن بندو کی ماں کو بلا بھیجا کہ ”بہن میرا مری کا منہ دیکھو جو اسی گھڑی نہ آؤ۔“

اور پھر دونوں میں کھسپ پھسپ ہوئی۔ بیچ میں ایک نظر دونوں کبریٰ پر بھی ڈال لیتیں جو دالان میں بیٹھی چاول پھٹک رہی تھی۔ وہ اس کا نا پھوسی کی زبان کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔

اسی وقت بی اماناں نے کانوں کی چار ماشہ کی لونگیں اتار کر منہ بولی بہن کے حوالے کیں کہ جیسے تیسے کر کے شام تک تولہ بھر گوکھر، چھ ماشہ سلمہ ستارا اور پاؤ گز نیفے کے لیے ٹول لادیں۔ باہر کی طرف والا کمرہ جھاڑ پونچھ کر تیار کیا۔ تھوڑا سا چونا منگا کر کبرئی نے اپنے ہاتھوں سے کمرہ پوت ڈالا۔ کمرہ توچٹا ہو گیا مگر اس کی ہتھیلیوں کی کھال اڑ گئی اور جب وہ شام کو مسالہ پیسنے بیٹھی تو چکر کھا کر دوہری ہو گئی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گزری۔ ایک تو ہتھیلیوں کی وجہ سے، دوسرے صبح کی گاڑی سے راحت آرہے تھے۔

”اللہ! میرے اللہ میاں! اب کے تو میری آپا کا نصیبہ کھل جائے۔ میرے اللہ میں سو رکعت نفل تیری درگاہ میں پڑھوں گی۔“ حمیدہ نے فجر کی نماز پڑھ کر دعا مانگی۔ صبح راحت بھائی آئے تو کبرئی پہلے ہی سے چھڑوں والی کوٹھری میں جا چھپی تھی۔ جب سیویوں اور پراٹھوں کا ناشتہ کر کے بیٹھک میں چلے گئے تو دھیرے دھیرے نئی دلہن کی طرح پیر رکھتی کبرئی کوٹھری سے نکلی اور جھوٹے برتن اٹھا لیے۔ ”لاؤ میں دھوؤں بی آپا۔“ حمیدہ نے شرارت سے کہا۔

”نہیں۔“ وہ شرم سے جھک گئی۔

حمیدہ چھیڑتی رہی، بی اماناں مسکراتی رہیں اور کریب کے دوپٹے میں لپٹا نکلتی رہیں۔ جس راستے کان کی لونگیں گئی تھیں اسی راستے پھول پتہ اور چاندی کی پازیب بھی چل دی اور پھر ہاتھوں کی دودو چوڑیاں بھی جو منجھلے ماموں نے رنڈا پاتا اتارنے پر دی تھیں۔ روکھی سوکھی خود کھا کر آئے دن راحت کے لیے پراٹھے تلے جاتے، کوفتے، بھنا پلاؤ مہکتے۔ خود سوکھا سا نوالہ پانی سے اتار کر وہ ہونے والے داماد کو گوشت کے لچھے کھلاتیں۔

”زمانہ بڑا خراب ہے بیٹی۔“ وہ حمیدہ کو منہ پھلاتے دیکھ کر کہا کرتیں۔ اور وہ سوچا کرتی۔ ہم بھوکے رہ کر داماد کو کھلا رہے ہیں۔ بی آپا صبح سویرے اٹھ کر جادو کی مشین کی طرح جٹ جاتی ہے۔ نہار منہ پانی کا گھونٹ پی کر راحت کے لیے پراٹھے تلے جاتی ہے۔ دودھ اونٹانی ہے

تاکہ موٹی سی ملائی پڑے۔ اس کا بس نہیں تھا کہ وہ اپنی چربی نکال کر ان پر اٹھوں میں بھر دے۔ اور کیوں نہ بھرے۔ آخر کو وہ ایک دن اس کا اپنا ہو جائے گا۔ جو کچھ کمائے گا اس کی ہتھیلی پر رکھ دے گا۔ پھل دینے والے پودے کو کون نہیں سینچتا؟ پھر جب ایک دن پھول کھلیں گے اور پھلوں سے لدی ہوئی ڈالی جھکے گی تو یہ طعنہ دینے والیوں کے منہ پر کیسا جوتا پڑے گا اور اس خیال ہی سے میری بی بی آپا کے چہرے پر سہاگ کھل اٹھتا۔ کانوں میں شہنائیاں بجنے لگتیں۔ اور وہ راحت بھائی کے کمرے کو پکلوں سے جھاڑتیں۔ ان کے کپڑوں کو پیار سے تہ کرتیں۔ جیسے وہ کچھ ان سے کہتے ہوں۔ وہ ان کے بدبودار چوہوں جیسے سڑے ہوئے موزے دھوتیں۔ بساندی بنیان اور ناک سے لتھڑے ہوئے رومال صاف کرتیں۔ ان کے تیل میں چچچاتے ہوئے تکیے کے غلاف پر سوئٹ ڈریم کا ڈھتیں۔ پر معاملہ چاروں کو نے چوکس نہیں بیٹھ رہا تھا۔ راحت صبح اندے پر اٹھے ڈٹ کر کھاتا۔ اور شام کو آکر کوٹے کھا کر سو جاتا۔ اور بی اماں کی منہ بولی بہن حکیمانہ انداز میں کھسر پھسر کرتیں۔

”بڑا شرمیلا ہے بے چارہ۔“ بی اماں تاویلیں پیش کرتیں۔ ”ہاں یہ تو ٹھیک ہے پر بھی کچھ تو پتا چلے رنگ ڈھنگ سے، کچھ آنکھوں سے۔“

”اے نوج، خدا نہ کرے میری لونڈیا آنکھیں لڑائے۔ اس کا آنچل بھی نہیں دیکھا ہے کسی نے۔“ بی اماں فخر سے کہتیں۔

”اے تو پردہ توڑوانے کو کون کہے ہے۔“ بی آپا کے پکے مہاسوں کو دیکھ کر انھیں بی اماں کی دوراندیشی کی داد دینی پڑی۔

”اے بہن، تم تو سچ میں بہت بھولی ہو۔ یہ میں کب کہوں ہوں۔ یہ چھوٹی ٹکڑی کون سی بکرید کو کام آئے گی؟“ وہ میری طرف دیکھ کر ہنستی۔

”اری اونک چڑھی! بہنوئی سے کوئی بات چیت، کوئی ہنسی مذاق، اونہہ واری

چل دیوانی۔“

”اے تو میں کیا کروں خالہ؟“

”راحت میاں سے بات چیت کیوں نہیں کرتی؟“

”بھئی ہمیں تو شرم آتی ہے۔“

”اے ہے، وہ تجھے پھاڑ ہی تو کھائے گا۔“ بی اماں چڑ کر بولیں۔

”نہیں تو۔ مگر.....“ میں لا جواب ہو گئی اور پھر مسکوت ہوئی۔ بڑی سوچ بچار کے

بعد کھل کے کباب بنائے گئے۔ آج بی آپا بھی کئی بار مسکرا پڑیں۔ چپکے سے بولیں۔

”دیکھو ہنسنا نہیں، نہیں تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔“

”نہیں ہنسوں گی۔“ میں نے وعدہ کیا۔

”کھانا کھا لیجئے۔“ میں نے چوکی پر کھانے کی سینی رکھتے ہوئے کہا۔ پھر جو پٹی کے نیچے

رکھے ہوئے لوٹے سے ہاتھ دھوتے وقت میری طرف سر سے پاؤں تک دیکھا تو میں بھاگی

وہاں سے۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اللہ تو بہ کیا خناس آنکھیں ہیں۔ ”جاگوڑی ماری

اری دیکھ تو سہی، وہ کیسا منہ بناتا ہے۔ اے ہے سارا مزا کر کر اہو جائے گا۔“

آپا بی نے ایک بار میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں التجا تھی۔ لوٹی ہوئی براتوں کا

غبار تھا اور چوتھی کے پرانے جوڑوں کی مانند اداسی۔ میں سر جھکائے پھر کھبے سے لگ کر

کھڑی ہو گئی۔

راحت خاموش کھاتے رہے، میری طرف نہ دیکھا۔ کھلی کے کباب کھاتے دیکھ کر مجھے

چاہیے تھا کہ مذاق اڑاؤں۔ قہقہہ لگاؤں کہ ”واہ جی واہ دولہا بھائی! کھلی کے کباب کھا رہے

ہو۔“ مگر جانو کسی نے میرا زرخہ دیوچ لیا ہو۔...

”کیا ہمارے یہاں کا کھانا آپ کو پسند نہیں آتا؟“ میں نے علی کر کہا۔

”یہ بات نہیں۔ کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کھلی کے کباب تو کبھی بھو سے

کی ترکاری۔“

”میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ہم سوکھی روٹی کھا کے اسے ہاتھی کی خوراک دیں۔ گھی ٹپکتے پراٹھے ٹھنسا نہیں۔ میری بی آپا کو جو شانہ نصیب نہیں اور اسے دودھ ملائی نگلوائیں۔“ میں بھٹا کر چلی آئی۔...

راحت نے پھر کسی بہانے سے مجھے پکارا۔ ”اونہہ!“ میں جل گئی۔ پر بی آپا نے کئی ہوئی مرغی کی طرح جو پلٹ کر دیکھا تو مجھے جانا ہی پڑا۔

”آپ ہم سے خفا ہو گئیں؟“ راحت نے پانی کا کٹورا لے کر میری کلائی پکڑ لی۔ میرا دم نکل گیا اور بھاگی تو ہاتھ جھٹک کر۔“

”کیا کہہ رہے تھے؟“ بی آپا نے شرم و حیا سے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ میں چپ چاپ ان کا منہ تنکنے لگی۔

”کہہ رہے تھے کس نے پکایا ہے کھانا۔ واہ واہ! جی چاہتا ہے کھاتا ہی چلا جاؤں۔ پکانے والی کے ہاتھ کھا جاؤں..... اوہ نہیں..... کھا نہیں بلکہ چوم لوں۔“

میں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا اور بی آپا کا کھڑ در اہلدی دھنیا کی بساند میں سر اہوا ہاتھ اپنے ہاتھ سے لگا لیا۔ میرے آنسو نکل آئے۔ ”یہ ہاتھ“ میں نے سوچا جو صبح سے شام تک مسالہ پیستے ہیں، پانی بھرتے ہیں، پیاز کاٹتے ہیں، بستر بچھاتے ہیں، جوتے صاف کرتے ہیں۔ یہ بے کس غلام صبح سے شام تک جُٹے ہی رہتے ہیں ان کی بیگار کب ختم ہوگی؟ کیا ان کا کوئی خریدار نہ آئے گا؟ کیا انھیں کبھی کوئی پیار سے نہ چومے گا؟ کیا ان میں کبھی مہندی نہ رچے گی؟ کیا ان میں کبھی سہاگ کا عطر نہ بے سے گا؟ جی چاہا زور سے چیخ پڑوں۔

”اور کیا کہہ رہے تھے؟“ بی آپا کے ہاتھ تو اتنے کھردرے تھے، پر آواز اتنی رسیلی اور میٹھی تھی کہ اگر راحت کے کان ہوتے تو..... مگر راحت کے نہ کان تھے نہ ناک بس دوزخ جیسا پیٹ تھا۔

”اور کہہ رہے تھے کہ اپنی بی آپا سے کہنا کہ اتنا کام نہ کیا کریں اور جو شانہ پیا کریں۔“

”چل جھوٹی۔“

”ارے واہ جھوٹے ہوں گے آپ کے وہ.....“

”اری چپ مُردار! انھوں نے میرا منہ بند کر دیا۔“

”دیکھ تو سوٹر بُن گیا ہے انھیں دے آ۔ پر دیکھ تجھے میری قسم میرا نام نہ لیجیو۔“

”نہیں بی آپا۔ انھیں نہ دو وہ سوٹر۔ تمھاری ان مٹھی بھر ہڈیوں کو سوٹر کی کتنی ضرورت

ہے؟“ میں نے کہنا چاہا پر کہہ نہ سکی۔

”آپا بی تم خود کیا پہنوگی؟“

”ارے مجھے کیا ضرورت ہے؟ چولھے کے پاس تو ویسے ہی جھلس رہتی ہے۔“

سوٹر دیکھ کر راحت نے اپنی ایک ابرو شرارت سے اوپر تان کر کہا۔

”کیا یہ سوٹر آپ نے بُنا ہے؟“

”نہیں تو۔“

”تو بھی ہم نہیں پہنیں گے۔“

میراجی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں کمینے۔ مٹی کے تودے۔ یہ سوٹر ان ہاتھوں نے بُنا ہے جو جیتے جاگتے غلام ہیں۔ اس کے ایک ایک پھندے میں کسی نصیبوں جلی کے ارمانوں کی گردنیں پھنسی ہوئی ہیں، یہ ان ہاتھوں کا بُنا ہوا ہے جو تھے پنگورے جھلانے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ان کو تھام لو۔ اور یہ دو پتوار بڑے سے بڑے طوفان کے تھیٹروں سے تمھاری زندگی کی ناؤ کو بچا کر پار لگا دیں گے۔ یہ ستار کے گت نہ بجا سکیں گے۔ منی پوری اور بھارت ناٹیم کے مدرانہ دکھا سکیں گے۔ انھیں پیانو پر رقص کرنا نہیں سکھایا گیا۔ انھیں پھولوں سے کھیلنا نہیں نصیب ہوا۔ مگر یہ ہاتھ تمھارے جسم پر چربی چڑھانے کے لیے صبح سے شام تک سلائی کرتے ہیں۔ صابن اور سوڈے میں ڈبکیاں لگاتے ہیں چولھے کی آٹچ سہتے ہیں۔ تمھاری غلاظتیں دھوتے ہیں تاکہ تم اُجلے چٹے بگلا بھگتی کا ڈھونگ رچائے رہو۔ محنت نے ان میں زخم ڈال دیے

ہیں۔ ان میں کبھی چوڑیاں نہیں کھنتی ہیں۔ انھیں کبھی کسی نے پیار سے نہیں تھاما۔...

”یہ سوئو تو آپ ہی پہن لیجیے۔ دیکھیے نا آپ کا کرتا کتنا باریک ہے؟“

جنگلی پٹی کی طرح میں نے اس کا منہ، ناک، گریبان اور بال نوچ ڈالے۔ اور اپنی پلنگڑی پر جاگری۔ بی آپا نے آخری روٹی ڈال کر جلدی جلدی تسلے میں ہاتھ دھوئے۔ اور آنچل سے پونچھتی میرے پاس آ بیٹھی۔

”وہ بولے؟“ ان سے نہ رہا گیا۔ تو دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

”بی آپا۔ یہ راحت بھائی بڑے خراب آدمی ہیں۔“ میں نے سوچا کہ میں آج سب کچھ بتا دوں گی۔

”کیوں؟“ وہ مسکرائیں۔

”مجھے اچھے نہیں لگتے..... دیکھیے میری ساری چوڑیاں چورہ ہو گئیں۔“ میں نے کانپتے ہوئے کہا۔

”بڑے شریر ہیں۔“ انھوں نے رومانٹک آواز میں شرما کے کہا۔

”بی آپا..... سنو بی آپا۔ یہ راحت اچھے آدمی نہیں۔“ میں نے سلگ کر کہا۔

”آج میں اتناں سے کہہ دوں گی۔“

”کیا ہوا؟“ بی اتناں نے جانماز بچھاتے ہوئے کہا۔

”دیکھو میری چوڑیاں بی اتناں۔“

”راحت نے توڑ ڈالیں۔“ بی اتناں مسرت سے بولیں۔

”ہاں!“

”خوب کیا۔ تو اسے ستاتی بھی تو بہت ہے۔ اے ہے تو دم کا ہے کونکل گیا۔ بڑی موم کی

بنی ہوئی ہو کہ ہاتھ لگایا اور پکھل گئیں۔“ پھر چپکار کر بولیں۔ ”خیر تو بھی چوتھی میں بدلہ لے لیجیو۔“

وہ کسر نکالو کہ یاد ہی کریں میاں جی۔“ یہ کہہ کر انھوں نے نیت باندھ لی۔

منہ بولی بہن سے پھر کانفرنس ہوئی۔

”اے ہے تو بڑی ہی ٹھس ہے۔ اے ہم تو اپنے بہنویوں کا خدا کی قسم ناک میں دم کر دیا کرتے تھے۔“

”یہ بات نہیں ہے بہن، آجکل کے لڑکوں کا دل بس تھالی کا بیگن ہوتا ہے۔ جدھر جھکا دو اُدھر ہی لڑھک جائے گا۔“

مگر راحت تو بیگن نہیں اچھا خاصا پہاڑ ہے۔ جھکاؤ دینے پر کہیں میں ہی نہیں پس جاؤں۔ میں نے سوچا۔ پھر میں نے آپا کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش دہلیز پر آ بیٹھیں، آٹا گوندھ رہی تھیں اور سب کچھ سنتی جا رہی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو زمین کی چھاتی پھاڑ کر اپنے کنوارے کی لعنت سمیت اس میں سما جاتیں۔۔۔

مگر اشاروں کنایوں کے باوجود راحت میاں نہ تو خود منہ سے پھوٹے اور نہ ہی ان کے گھر ہی سے پیغام آیا۔ تھک ہار کر بی امّاں نے پیروں کے توڑے گروں رکھ کر پیر مشکل کشا کی نیاز دلا ڈالی۔ دوپہر بھر محلے ٹولے کی لڑکیاں صحن میں اودھم مچاتی رہیں۔ بی آپا شرمائی لجائی چٹھروں والی کوٹھری میں اپنے خون کی آخری بوندیں چُسانے کو جا بیٹھیں۔۔۔ بی آپا کی سہیلیاں ان کو چھیڑ رہی تھیں اور وہ خون کی پچی کھچی بوندوں کو تاؤ میں لا رہی تھیں۔ آج کئی روز سے ان کا بخار نہیں اُتر اُتھا۔ تھکے ہارے دیے کی طرح ان کا چہرہ ایک بار ٹمٹماتا اور پھر بجھ جاتا۔ اشارے سے انھوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ اپنا آنچل ہٹا کر نیاز کے ملیدے کی طشتری مجھے تھادی۔

”اس پر مولوی صاحب نے دم کیا ہے۔“ ان کی بخار سے دہکتی ہوئی گرم گرم سانس میرے کان میں لگی۔۔۔

”یہ..... یہ ملیدہ۔“ اس نے اُچھلتے ہوئے دل کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔ اس کے پیر لرز رہے تھے۔ جیسے وہ سانپ کی بانہی میں گھس آئی ہو۔ اور پھر پہاڑ کھسکا.....! اور منہ کھول دیا۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔ مگر دور کہیں بارات کی شہنائیوں نے چیخ لگائی۔ جیسے کوئی ان کا گلا گھونٹ

رہا ہو۔ کانپتے ہاتھوں سے مقدس ملیدے کا نوالہ بنا کر اس نے راحت کے منہ کی طرف بڑھا دیا۔

ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پہاڑ کی کھوہ میں ڈوبتا چلا گیا۔ نیچے تعفن اور تاریکی کے اتھاہ غار کی گہرائیوں میں اور ایک بڑی سی چٹان نے اس کی چیخ کو گھونٹ دیا۔
نیاز کے ملیدے کی رکابی ہاتھ سے چھٹ کر لائین کے اوپر گری اور لائین نے زمین پر گر کر دو چار سسکیاں بھریں اور گل ہو گئی۔ باہر آنگن میں محلے کی بہو بیٹیاں مشکل گشتا کی شان میں گیت گارہی تھیں۔

صبح کی گاڑی سے راحت مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوا روانہ ہو گیا۔ اس کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور اسے جلدی تھی۔

اس کے بعد اس گھر میں کبھی انڈے نہ تلے گئے۔ پرائیڈ نہ سکے اور سوٹر نہ بنے گئے۔
دق نے جو ایک عرصے سے بی آپا کی تاک میں بھاگی پیچھے پیچھے آرہی تھی ایک ہی جست میں انھیں دبوچ لیا اور انھوں نے چپ چاپ اپنا نامراد وجود اس کی آغوش میں سوپ دیا۔
اور پھر اس سہ دری میں چوکی پر صاف ستھری جازم بچھائی گئی۔ محلے کی بہو بیٹیاں جڑیں۔ کفن کا سفید سفید لٹھا۔ موت کے آنچل کی طرح بی امان کے سامنے پھیل گیا۔ تھل کے بوجھ سے ان کا چہرہ لرز رہا تھا۔ بائیں ابرو پھڑک رہی تھی گالوں کی سنسان جھڑیاں بھائیں بھائیں کر رہی تھیں۔ جیسے ان میں لاکھوں اثر دے پھنکار رہے ہوں۔

لٹھے کی کان نکال کر انھوں نے چو پر تہ کیا اور ان کے دل میں ان گنت قینچیاں چل گئیں۔
آج ان کے چہرے پر بھیا نک سکون اور ہرا بھرا اطمینان تھا۔ جیسے انھیں پکا یقین ہو کہ دوسرے جوڑوں کی طرح چوتھی کا یہ جوڑا سینما نہ جائے گا۔

ایک دم سہ دری میں بیٹھی لڑکیاں، بالیاں میناؤں کی طرح چپکنے لگیں۔ حمیدہ ماضی کو دور جھٹک کر ان کے ساتھ جاملی۔ لال ٹول پر..... سفید گزی کا نشان! اس کی سرخی میں نہ جانے کتنی

معصوم دلہنوں کا سہاگ رچا ہے اور سفیدی میں کتنی نامراد کنواریوں کے کفن کی سفیدی ڈوب کر اُبھری ہے اور پھر سب ایک دم خاموش ہو گئے۔ بی امّاں نے آخری ٹانکا بھر کے ڈورہ توڑ لیا۔ دو موٹے موٹے آنسو ان کے روئی جیسے نرم گالوں پر دھیرے دھیرے رینگنے لگے۔ ان کے چہرے کی شکنوں میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ نکلیں اور وہ مسکرا دیں۔ جیسے آج انھیں اطمینان ہو گیا کہ ان کی کبریٰ کا سوا جوڑا بن کر تیار ہو گیا ہو اور کوئی دم میں شہنائیاں بجائیں گی۔

مشق

لفظ و معنی

سہ دری	:	تین دروازوں والا دالان
جازم	:	فرش پر بچھائی جانے والی گل بوٹے والی بڑی چادر یا چاندنی
واردات	:	واقعہ، جو بات پیش آئے۔ اسی لیے جرم کو بھی واردات کہتے ہیں مثلاً فلاں جگہ ایک واردات ہو گئی
ٹول	:	لال رنگ کا سوتی کپڑا
پاٹ	:	چوڑائی خاص کر کپڑے یا ندی کی
چھٹی	:	بچے کی پیدائش کے چھٹے دن کی تقریب
چھوچھک	:	دودھ پلانے والی دائی، وہ سامان جو چھٹی کے دن بچے اور اس کی ماں کے لیے ماں کے گھر سے آتا ہے
بیونت	:	کاٹ، تراش
پنڈی	:	کترنوں کو ایک ساتھ پلٹنا

استقلال	:	مستقل مزاجی، بھراؤ
گرہ	:	گزر کا سولہواں حصہ
چارگرہ	:	گزر کا چوتھائی حصہ
نیلگوں	:	نیلے رنگ کا
کونڈی	:	چھوٹا کونڈا جو اکثر مٹی یا پتھر کا بنا ہوتا ہے
روپیلی	:	چاندی یا چاندی کے رنگ کی
مَت کٹ جانا	:	عقل ماری جانا
شگون لینا	:	کسی کام کو شروع کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش کہ اس کا کرنا ٹھیک ہوگا یا نہیں، ایسی بات جس سے آئندہ ہونے والی بات کا اندازہ ہو سکے
مشتاقی	:	مہارت
دھنک گوکھرو	:	دوپٹے کے کنارے پر لگایا جانے والا گوثا، گوثا جس میں ہلکے ہلکے کانٹے ہوتے ہیں
علم	:	جھنڈا
سناونی	:	موت کی خبر
لپٹا	:	دوپٹے پر ٹانگی جانے والی کرن
پھول، پتہ، پازیب	:	مختلف زیورات کے نام۔ پھول اور پتہ کان کے زیور ہیں پازیب ایک زنجیر ہے جسے ٹخنوں کے اوپر باندھتے ہیں
رنڈا پاتا رنا	:	عدت کی مدت ختم ہونا
حکیمانہ	:	دانش مندانہ
تاویل	:	بہانہ، توجیہ

مُسکُوٹ	:	خفیہ صلاح و مشورہ
خَناس	:	شیطان
زخَرہ	:	سانس کی نالی
مٹی کے تودے	:	مٹی کے مادھو
گت	:	دھن
مُدرا	:	بھاؤ بتانا
بانہی	:	پل
تَحْمَل	:	برداشت کی طاقت
چوپر تہ کرنا	:	چار تہیں بنانا

غور کرنے کی بات

- اس افسانے میں بہت سے ایسے الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے جو زیادہ تر عورتیں استعمال کرتی ہیں۔ جیسے: چھٹی چھوچھک۔ لپا چھپ۔ آگ لگے موئے کو۔ خاک پڑے۔ اری چل دیوانی۔ مسکوٹ۔ مجھ مری کا منہ دیکھو۔ نگوڑی۔ کم بخت۔ نامراد۔
- شادی بیاہ اور بچوں کی پیدائش وغیرہ کے موقع پر عموماً طرح طرح کے وہموں میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر اس افسانے میں چوتھی کے جوڑے کی تیاری کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ اگر اس جوڑے کی کتربونت میں کہیں غلطی ہو جائے تو کس کس طرح کی رکاوٹیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اگرچہ تعلیم کے عام ہو جانے کی وجہ سے اس میں کمی واقع ہوئی ہے۔ تاہم گاؤں دیہات میں اب بھی ساعت، شگون اور رسم و رواج کی بڑی پابندی کی جاتی ہے۔ اور اگر ان میں کسی طرح کی کمی ہو جائے یا کوئی کسر باقی رہ جائے تو اسے بدشگونئی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

- اس افسانے میں محاوروں اور کہاوتوں کا بر محل استعمال کیا گیا ہے۔

سوالات

1. کبریٰ سہ دری کی چہل پہل سے دور کیوں رہتی تھی؟
2. راحت کے آنے کی خبر سن کر بی امّاں کے چھٹے کیوں چھوٹ گئے؟
3. ”جس راستے کان کی لونگیں گئی تھیں، اسی راستے پھول، پتہ اور چاندی کی پازیب بھی چل دی۔“ اس جملے کا کیا مطلب ہے اور اس سے کبریٰ کے گھریلو حالات پہ کیا روشنی پڑتی ہے؟
4. راحت کے کردار کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

عملی کام

- اس افسانے میں ایسے بہت سے با محاورہ جملوں کا خوب صورت استعمال کیا گیا ہے آپ ان جملوں کی نشان دہی کیجیے، اور ان محاوروں کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔
- اس افسانے میں آپ کو کون سا کردار سب سے زیادہ پسند آیا اور کیوں؟ دلیلوں کے ساتھ بیان کیجیے۔
- اس افسانے کا موضوع ہمارے موجودہ حالات کی کیا ترجمانی کرتا ہے؟